دوہری مار کھائیں گے۔ ایک تو ہمیں ان دونوں شناختوں کا شکریہ ادا کرنا پڑے گا۔ دوسری مصیبت پہلی سے بھی بڑی ہے۔ ہمیں پاکستان اور اسلام کی لاج نبھانے کے لئے ان شناختوں کے وقار کو قائم رکھنے کے لئے بہتر کردار پیش کرنا ہوگا۔ اسی لئے ہم چھوئی موئی شناخت سے گزارہ چلاتے ہیں۔

نثار ترنگ میں بولتا گیا۔

بات نثار بڑے پتے کی کہہ رہا تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس کا چہرہ گفتگو سب کچھ برا لگا۔

میں نے اپنی علمیت جتانے کے لئے اور نثار سے ون اپ ہونے کے انداز میں کہا۔

نثار صاحب ہم لوگ مغرب سے مرعوب ہو چکے ہیں۔ ہمیں بھول چکا ہے کہ ہمارے پاس بھی کوئی علم ہے یا تھا، بالکل منفرد..... اور جو کام اس علم کی حدود میں رہ کر یا اس کے ضابطے پر پورا نہیں اترتا، وہ بیکار ہے۔ ہم ترقی کی چکاچوند سے اس درجہ متاثر ہیں کہ اب ہمیں فلاح کے راستے پر چلتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ہم اس خیال کو ترک کرنا چاہتے ہیں کہ فلاح کے بھی کچھ فائدے ہو سکتے ہیں اور فلاح کے ہمراہ بھی ترقی ممکن ہے..... فلاح کا راستہ بالآخر انسان کو بدلنے اور انعام یافتہ لوگوں کے سیدھے راستے پر ڈالنے کا عمل ہے۔ اس راستے پر جو بھی تبدیلی آتی ہے، انسان کے لئے بہتر ہے۔ خیال ہی کی پنیری لگائی جاتی ہے اور جالی کا یہ کاڑھنا ایسے بیل بوٹوں سے مشابہ ہو جاتا ہے جن کا جمال حقیقی بیلوں سے بھی خوبصورت ہوا کرتا ہے، لیکن اب ہم خیال کو واہمہ سمجھتے ہیں اور فلاح کے خیال سے بھی بھاگتے ہیں۔

مغربی معاشرہ نے لوڈو کے کھیل میں اپنا چھکا ڈال کر ترقی کی گوٹی چلا دی ہے۔ اس فیصلے کے پیچھے سائنس کی ایجادات ہی نہیں، بلکہ بھانت بھانت کیلوگوں کے ساتھ فاصلے قائم رکھتے ہوئے اپنی فائدے کے لئے مفاہمت کے ساتھ رہنے کا نسخہ بھی ہے۔ نیگرو اور براؤن لوگوں کے ساتھ رگڑ کھائے بغیر اور ان کے مذاہب کے خلاف

تلوار نکالے بنا گزران کرنے کے عمل نے مغربی معاشرے میں بڑی واضح تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ان لوگوں میں دوسرے Ethnic Groups کے ساتھ افہام وتفہیم پیدا کرنے کے لئے کچھ تبدیلی کی اشد ضرورت تھی۔ان لوگوں نے جو اکثریت میں تھے اور ترقی کے خواہاں بھی تھے۔اپنے فائدے کے لئے بھاری جنگلوں کو کاٹنے، ریل کی پٹریاں بچھانے، عمارتیں اسارنے، سڑکیں بچھانے، انڈسٹری کو چالنے کے لئے جن کالے براؤن لوگوں کو درآمد کرلیا۔ان کے ساتھ سوشل جسٹس کی خاطر نہیں، بلک زیر دام لانے کی پالیسی کے تحت بڑی فراخ دلی دکھائی۔اپنے لوگوں کو Racist ہونے سے روکنے کے لئے ضروری تھا کہ مذہب سیدا بستگی کو Bulldozer سے ہموار کیا جائے۔ اب امریکن ہولے ہولے اپنے اعتقادات اور عیسائی Doctrine کے اصولوں کو نرم کرتے کرتے اور دوسرے مذاہب کے لئے گنجائش پیدا کرتے ہوئے اس قدر ترقی پسند ہوگیا ہے کہ اس کا ایمان ہی مذہب سے اٹھ گیا۔ دراصل لبرل انسان کے پاس ایمان جیسی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ وہ ہر راستے کا مسافر ہوتا ہے، جبکہ ایک راسخ خیال پر چلنے والا اپنا راستہ چھوڑتا نہیں اور کسی اور کی راہ پر جاتا نہیں۔ وہ معاف کرسکتا ہے۔ دوسرے لوگوں کے اعتقادات کو غلط جانتے ہوئے بھی ان پر تنقید نہیں کرتا، لیکن وہ کسی قیمت پر اپنے خیال کو چھوڑنے پر رضا مند نہیں ہوتا۔اپنے ایمان کی اتنی بھاری قیمت وہ ادا نہیں کرسکتا، یہی سارا بکھیڑا ہے۔

نثار صاحب کا چہرہ لال بھبھوکا ہو چکا تھا۔وہ قرولی لانے والا خوجی بن چکا تھا۔اسی وقت اقبال آگئیں۔

آؤ آؤ اقبال۔بھئی کہاں رہ گئیں تھیں تم.....

کہیں نہیں نثار..... ذرا گروسریز کرنے گئی تھی۔ذرا مجھے ہلپ تو کرنا۔

کار میں سے سامان نکال لاؤ پلیز۔

کمال ہے، نہ سلام نہ دعا۔اچھی بدتمیزی ہے ڈیزی۔

ارجمند اورلال مجھے معاف کر دیں گے کوئی بات نہیں۔ یہ دونوں بڑے سویٹ ہیں۔

میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں آنٹی..... آیئے.....

ارجمند اور اقبال باہر چلی گئیں۔

میں نے سکھ کا سانس لیا۔ یہ اقبال وہ نہ تھی جس کو میں تلاش کر رہا تھا۔ یہ ایک موٹی آنٹی تھی جس کا جسم اس بات کا غماز تھا کہ وہ خوب کھانے پینے اور خوش رہنے کا فن جانتی ہے۔ ایک خیال کے بدلتے ہی خیالات کی ساری قوس قزح بدل گئی۔ یکدم مجھے نثار ایک بڑا ہی اچھا مہذب انسان نظر آنے لگا۔ نہ ہم میں کوئی نظریاتی اختلاف تھا۔ نہ ہی ہم دونوں جھکی بڈھے تھے۔ اس کے بعد گفتگو خود بخود رواں اور ملائم ہوگئی۔

واپسی پر ارجمند نے مجھے سوال کیا..... ''ابا جی آپ کو شروع میں کیا ہو گیا تھا۔ خواہ مخواہ انکل نثار سے جھڑپ رہے تھے؟ وہ تو اتنے نائس آدمی ہیں۔ آپ انہیں Pinch کر رہے تھے بار بار..... بیچارے''

''وہ بیٹے ایک حجاب آ گیا تھا..... ایک خیال کی وجہ سے۔ بڑھاپے میں انسان وسوسے کا شکار ہو جایا کرتا ہے۔ وجہ ہو نہ ہو جھگڑنا چاہتا ہے۔ خون گرم کرنے کا یہ ایک بہانہ ہے۔''

''کون سا حجاب، کونسا وسوسہ؟'' بلال نے سوال کیا۔

''پلیز آرام سے ڈرائیو کریں۔ کوئی ضرورت نہیں باتیں کرنیکی Hov والی سڑک لے لیں.....''

جمشید اور قیصر پچھلی سیٹ پر بحث کر رہے تھے۔ ایک بار پھر ارجمند نے بلال کو مشورہ دے کر اپنا آپ بہتر ثابت کرنے کی کوشش میں بلال کو بھڑکا دیا تھا۔ وہ دونوں اپنی اپنی برتری ثابت کرنے میں جھگڑتے چلے گئے۔

میں سوچ رہا تھا اگر نثار کی بیوی آپیا والی اقبال نکل آتی تو کیا پھر میں ایسا ٹھنڈا ٹھار بیٹھا ہوتا۔ کیا لانگ آئی لینڈ میرے اندر لانگ یادوں کو جنم دے دیتا.....؟ انسان بھی کیا احمق مخلوق ہے۔ حالات کو اپنے جذبات سے علیحدہ کر کے دیکھ ہی نہیں سکتا۔ کسی ردعمل کو فروغ دینے سے پہلے کیا تفکر کی شرط ضروری ہے؟ کیا تفکر درست سمت کے لئے اہم ہے، ہولے ہولے اقبال کو نہ دیکھ سکنے پر میرے دل میں پہلے اطمینان ابھرا .....پھر خوشی در آئی اور آخر میں ایسی مایوسی چھائی جس کا کوئی نام نہ تھا.....

فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔

رات کافی جا چکی تھی۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا۔ کوئی فون اٹھانے نہیں آ رہا تھا۔

جی.....

دوسری جانب ایک لڑکی بولی.....سنیئے.....آپ کو نیویارک میں اردو مرکز میں پہنچنا ہے۔ یہاں ایک مشاعرہ ہو رہا ہے.....لڑکی نے مشاعرے کی ساری تفصیل تاریخ اور مقام مشاعرہ مجھ زبانی سمجھایا۔

اس توجہ کا شکریہ لیکن.....میرا نام ہمایوں فرید ہے۔ کیا آپ کو ہمایوں فرید ہی درکار ہے؟

ہم آپ کو ہوائی جہاز کا ٹکٹ نہیں دے سکتے، لیکن اگر آپ نیویارک اپنی کار پہنچ جائیں تو مہ آپ کو گیس کے پیسے دے دیں گے۔ دراصل یہ مشاعرہ آپ کے اعزاز میں ہی کیا جا رہا ہے۔

میرے اعزاز میں؟.....لیکن میں تو اپنے ملک میں بھی مشہور نہیں۔

میں حیران رہ گیا۔ یہ کیسا اعجاز ہے کہ یہاں پہنچ کر مجھے اچانک شہرت مل گئی۔

بی بی پاکستان میں جب بڑے بڑے مشاعرے ہوتے ہیں تو مجھے مدعو نہیں کیا جاتا.....

مجھے پتہ نہیں سر، لیکن مجھے صدیقی صاحب نے آرڈر دیا تھا۔ میں نے فون کر دیا۔

مجھے تفصیل معلوم نہیں۔ میں سوچنے لگا۔ یہ صدیقی صاحب کون ہیں۔

کسی نے تو میرا نام پرپوز کیا ہوگا بی بی.....

ضرور کیا ہوگا جی..... فون پر بی بی کی آواز آئی، لیکن مجھے معلوم نہیں..... پاکستان سے بھی چند شاعر شریک ہوں گے۔ آپ پلیز مجھے ابھی کنفرم کر دیں۔ مجھے پاکستان بھی فون کرنے ہیں۔

یہ بھی عجیب ملک تھا۔ یہاں جو پہلے شہر کے دروازے پر دستک دے دیتا، وہی بادشاہ بن جاتا۔ یہاں للو کولیاں کر کے معتبر ہو سکتا ہے؟ کہاں شاعری کہاں میری تک بندی، لیکن جب دینے والے کو چھپڑ پھاڑ کر دینا ہو تو وہ کب پوچھتا ہے؟ عزت اور رزق کے بارے میں اس کی منطق تک انسان کبھی نہیں پہنچ پاتا۔

صبح جب میں نے ارجمند سے بات کی تو وہ بڑی خوش ہوئی..... دیکھا ناں ابا جی ..... دیر آید درست آید..... آپ کا ٹیلنٹ بیکار نہیں گیا سب چلیں گے.....؟ ہم سب، بچوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان کے نانا کتنے بڑے آدمی ہیں۔

لیکن میرا نام کس نے دیا..... کون ہو سکتا ہے وہ۔

چھوڑیں ابو کوئی ہو..... یہ سوچنے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ کے اعزاز میں مشاعرہ ہے اتنا کافی ہے، آپ Celebrity ہیں ابو آج کے بعد۔

اردو مرکز کی جانب سے میرے اعزاز میں مشاعرہ کیا گیا تھا۔ تعجب! ہم لیٹ پہنچے، اس لئے فوراً مجھے ایکس پر بٹھا دیا گیا۔ ہوٹل کے بڑے شاندار ہال میں شائقین جمع تھے۔ پاکستان سے شاعروں کا ایک گروہ محض اس مشاعرے میں شرکت کے لئے آیا بیٹھا تھا۔ جب ساری ڈائیس سج گئی اور پیلے گاؤ تکیوں سے ٹیک لگا کر شاعر اور شاعرات براجمان ہو گئیں تو ایک میری عمر کا آدمی سٹیج پر دائیں جانب سے برآمد ہوا۔ اس نے سفید اچکن، چوڑی دار پاجامہ اور سلیم شاہی جوتا پہن رکھا تھا۔ اس کی چال راج ہنسوں کی طرح اور مسکراہٹ میں نمی نمی پھوار کی سی خنکی تھی۔ اتنا خوبصورت

مڈل ایج آدمی سارے ہال میں نظر نہ آیا۔ مسٹر گریس فل مائیک تک پہنچا۔ اس دوران سارا ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ناظرین کا من چاہا ہے۔

بیٹھ کر اس نے نزت کے ساتھ مائیکروفون کو ٹسٹ کیا اور ریشمی کھرج میں بولا۔

''اردو مرکز کی جانب سے یہ مشاعرہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ آج کی شام میں نثار احمد صدیقی آپ کا میزبان ہوں۔ صاحب صدر! ہمایوں فرید صاحب کی اجازت سے سب سے پہلے ہی اپنا کلام سنانے کی اجازت چاہتا ہوں..... اجازت ہے''۔

ابھی جب وہ تعارف کرانے کے مرحلے میں تھا ہال کے بائیں دروازے سے ایک خواب برآمد ہوا۔ اقبال ہلکے گرے لباس میں چلی آرہی تھی۔ سامنے کی ساری قطار بھر چکی تھی۔ وہ سیدھی آئی اور Reserve اکلوتی خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔ نہ جانے اس نے کون سی خوشبو لگا رکھی ہوگی، لیکن مجھے لگا سارے میں ایوننگ انیپرس کی مہک پھیل گئی۔

جس وقت نثار غزل کا چوتھا شعر پڑھنے کے عمل میں تھا۔ میں نے اسے بے تحاشہ داد دی۔ اقبال نے پہلی مرتبہ میری جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں ویسی ہی تھیں۔ اوپر والے ہونٹ پر تل بھی وہی تھا، لیکن رنگت اب میدہ و شہاب نہ تھی۔ باسی چنبیلی کے پھولوں کی طرح چہرہ سانولے پن کی طرف مائل تھا۔ بالوں کا رنگ کالا اور سفید مل کر سلیٹی سا نظر آتا تھا اور اس نے گرے لباس ان ہی بالوں کی مناسبت سے پہن رکھا تھا، لیکن وہ بوڑھی نہیں تھی۔ وہ پہلے سے بھی جاذب نظر تھی۔

انٹرول کے دوران ہم سب Refreshments کے لئے چلے گئے۔ اقبال ایک گول میز منتخب کر کے بیٹھ گئی..... ارجمند اور بلال کچھ فاصلے پر بیٹھے کھانے پینے اور بحث کرنے میں مشغول تھے..... بچے نہ جانے کہاں بیٹھے؟ میں کھسکتا ہوا اقبال کے پاس جا بیٹھا۔ ہم دونوں کو بات شروع کرنے میں چند لمحے وقت کا سامنا ہوا۔

السلام علیکم..... وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

وعلیکم السلام..... میں نے بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ جہانگیر ارجمند یہیں امریکہ میں ہیں۔ میں نے تعارف کے طور پر لایعنی سی بات کی۔

آپیا کیسی ہیں؟ اس نے پوچھا۔

ٹھیک ہیں۔ آپ کے بچے؟

اس نے لمبی آہ بھری..... وہ..... اللہ نے ایک بیٹی دی تھی، لیکن وہ نارمل نہیں ہے ..... اسی کے علاج کے سلسلے میں ہم یہاں امریکہ آئے بیٹھے ہیں..... یہاں آکر اسے بڑا فرق پڑ گیا ہے..... اب کچھ کچھ ذمہ دار بھی ہو رہی ہے..... پہلے تو.....

اس نے ایک گرے رنگ کا ٹیشو آستین سے نکال کر آنسو پونچھے۔

''پتہ نہیں کیوں آپ کو دیکھ کر رونا آ گیا ہمایوں صاحب..... ورنہ اب تو..... مونا کی باتوں پر بھی رونا نہیں آتا.....''

مجھے لگا اندر ہی اندر کوئی میری عمارت منہدم کرنے میں مشغول تھا اور اس کے گرنے کی آواز اقبال تک پہنچ رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد گریس فل نثار احمد صدیقی میزوں میں راستہ بناتا ہماری طرف آیا۔ اس کے سارے بال قریباً سفید تھے، لیکن چہرہ بچوں کی طرح معصوم اور کھلا کھلا تھا۔ صرف آنکھوں میں عمر نے شکستگی کا گرے رنگ بھر دیا تھا۔ چال میں ٹینس کے کھلاڑی کا لچکیلا پن تھا۔ وہ قریب آیا تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔

بیٹھیے بیٹھیے۔ السلام علیکم۔

ہم دونوں نے اکٹھے کہا۔

یہ ہمایوں صاحب ہیں۔ آپیا کے بھائی۔

نثار ایکٹروں کی طرح حسین، ڈزائیز کپڑے پہننے والے ماڈل کی طرح خوش پوش ریڈیائی آواز میں بولا..... ''السلام علیکم..... اقبال آپیا کی بہت باتیں کرتی ہے دراصل ان کی Infatuation ابھی ختم نہیں ہوئی۔ یہ اسی عہد میں رہتی ہیں۔

ہم خوش دلی سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے، لیکن میں نثار سے مات کھا گیا۔ اس میں کچھ ایسا تھا کہ میں اس سے بغض بھی پال نہ سکا۔ وہ جتنا باہر خوبصورت تھا، اس سے کہیں زیادہ اندر حسین تھا۔ میری طبیعت اس وقت پھر خباثت کی طرف مائل ہوگئی اور میں نے اس میں ایسی باتوں کی تلاش جاری کر دی جو میری نفرت کی بنیاد بن سکتیں۔

امریکہ میں مشاعرے کی روایت کو بڑی خوبی سے نیا جنم دیا گیا ہے..... ادھر پاکستان سے ہر شاعر کی یہی آرزو ہوتی ہے کہ وہ مشاعرہ پڑھنے امریکہ پہنچ جائے۔ یہ آپ کے مشاعرے احیائے اردو کے لئے بڑی خدمت کا کام دے رہے ہیں۔ میں نے بات کرنے کی خاطر کہا۔

''انسان جب وطن سے بچھڑتا ہے تو کئی چیزیں اس کے ساتھ ایسی آجاتی ہیں جن کا بادی النظر میں اسے احساس بھی نہیں ہوتا۔ شروع شروع میں تو یار لوگوں نے مجھے کمپیئر بنا دینا، پھر خود بخود شعر مجھ میں ابلنے لگے..... ایک بات کا کریڈٹ میں اقبال کو بھی دیتا ہوں۔ اس نے شاعری سے محبت کر کے مجھے شاعر بنا دیا..... اسی نے آج آپ کو صاحب صدر بھی چنا ہے۔'' نثار بولا۔

''آپ نے ٹھیک کہا۔ مشاعروں نے امریکہ میں اردو کو نیا جنم دیا ہے۔ مجھ جیسے لوگ تن من دھن سے اس کی خدمت کر رہے ہیں اور سمجھئے یہی ہمارا قومی مشن ہے''۔

میں کچھ ہارسی محسوس کر رہا تھا۔ پھر میں نے اپنی شیخی میں اسے نیچا دکھانے کا رخ پیدا کیا۔

یہ تو ٹھیک ہے کہ آپ نے ان مشاعروں کے طفیل اپنی طبیعت موزوں کر لی، لیکن پیدائشی شاعر کو یہ مجاہدہ نہیں کرنا پڑتا۔ اس کے اندر ہمیشہ سے یہ جوہر موجود ہوتا ہے

.....

بالکل..... بالکل مجھے اقبال نے بتایا تھا کہ آپ پیدائشی شاعر ہیں۔ آپ نے بھلے اس کی طرف توجہ نہ دی، لیکن آپ سے تو مقابلہ نہیں کیا جا سکتا.....

مجھے پھر ہلکا سا احساس شکست ہوا۔

اقبال نے میری جانب دیکھا۔اس کی نظر میں گئے دنوں کا سراغ موجود تھا۔

پتہ نہیں کیا بات ہے ہمایوں صاحب..... جب میں سرکاری افسر تھا تب مجھے لگتا تھا ہے کہ میں اور کوئی کام نہیں کر سکتا۔پھر امریکہ آ گئے۔مجبوری تھی۔یہاں میں نے کئی سال بنک کی نوکری کی۔مجھے لگا کہ میں ہمیشہ بینکر رہا ہوں۔اب سب کاموں سے فارغ ہو کر لگتا ہے کہ میرے اندر تو ازل سے ایک شاعر رہتا تھا اور وہی ایک حقیقت تھی۔باقی سب جھوٹ تھا..... میں شاعر کے علاوہ اور کچھ کبھی تھا ہی نہیں.....

میں نے کافی کا گھونٹ نگلتے ہوئے اس کی طرف یکھا تو یہ اصلی نثار تھا۔اصلی اور وڈا نثار۔وہ نثار جس کے مرنے کی خبر میں نے پڑھی تھی اور خوش ہوا تھا۔نہ جانے وہ کون تھا؟ اور لانگ آئی لینڈ والا نثار؟ اور واشنگٹن ڈی سی کا چھلاوہ؟ وہ سب! یہ خوش لباس، خوش اطوار گریک مجسمہ جسے میں آنکھ بھر کر نہ دیکھ سکتا تھا۔اس کے ساتھ تو اقبال کی اچھی گزری ہوگی..... خوش رہی ہوگی ہمیشہ۔میں نے تاسف سے سوچا۔

ایک نوجوان نے آ کر نثار کے کان میں کچھ کہا تو وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

معاف کیجئے دو تین شاعروں میں لڑائی ہوگئی ہے، مجھے ایکسوز کیجئے۔

چند قدم چلنے کے بعد وہ لوٹا اور شرارت سے مسکرا کر بولا..... ہمایوں صاحب یہ تو بتائیے یہ جتنے شاعر لوگ پاکستان سے آتے ہیں، اتنے جھگڑالو کیوں ہوتے ہیں۔ہم تو ان کے نخرے برداشت کرتے کرتے نڈھال ہو جاتے ہیں۔کسی کو کمرہ پسند نہیں آتا۔ کوئی کھانے کا رونا روتا ہے، کسی کو کافی سیر میسر نہیں آتی۔کوئی سمجھتا ہے ہم نے انہیں داد سے محروم رکھا..... عجب مشکل ہے یہ کہہ کر وہ جلدی سے چلا گیا۔

اس دیوتا روپی کے سامنے میں احساس کمتری میں مبتلا ہو گیا۔عجیب قسم کی محرومی اور غصہ میرے اندر ابلنے لگا۔

آپیا کیسی ہے؟ اقبال نے کچھ دیر سے کہا۔اسے اس سے بہتر تعارفی جملہ سوجھ نہ رہا

تھا۔

ٹھیک ہے۔

خاموشی کا لمبہ وقفہ

آپ اپنے متعلق بھی تو کچھ بتائیں ناں۔ اقبال نے سوال کیا۔ مردوں جیسا نام رکھنے والی میں بڑی نسوانیت تھی۔

پتہ نہیں یہ برسوں سے دبی ہوئی باتیں تھیں یا ایک طرح کا غصہ تھا جو اچانک لاوا بن کر پھٹ پڑا۔

میں نے کہا..... جب تم سے آخری بار مل کر آیا..... تو دل میں ایک ہی خواہش گڑ گئی اقبال۔ مجھے ہر لمحے یہ خیال رہنے لگا کہ اگر میں کسی طرح امیر کبیر ہو جاؤں..... تو پھر تمہارے ابا جی مجھ پر مہربانی کر سکتے ہیں۔ اس خیال کی آگ نے مجھے راکٹ بنا دیا۔ پہلے میں نے مال پر دکان کھولی پھر ڈیفنس میں کوٹھی بنائی۔ تم کسی نثار صاحب سے بیاہ کر اسلام آباد چلی گئیں، لیکن امیر ہونے کے خواب نے مجھے نہ چھوڑا..... میں بلاوجہ امیر کبیر ہونا بھی چلا گیا، لیکن امیر ہونے کے خواب نے مجھے نہ چھوڑا..... میں بلاوجہ امیر کبیر ہونا بھی چلا گیا، لیکن شاعر نہ رہ سکا۔ شاہد بھائی شاعر بن گئے، لیکن میں نے خیالوں کا، احساسات کا پیچھا کرنا چھوڑ دیا۔ میں صرف دولت اور اسی سے وابستہ ترقی کا گاہک تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کسی دن کوئی دیکھے اور افسوس کرے کہ اس نے میرے وجود میں کیا کھو دیا ہے۔

اور آپ کے بچے..... بیوی..... بھاری پپوٹوں والی نے پوچھا۔

دو بچے ہیں، ایک بیٹا جہانگیر اور ایک بیٹی ارجمند۔ بتایا ناں بیٹی وہ سامنے بیٹھی ہے اور جہانگیر بھی یہیں ہے امریکہ میں۔

اور آپ کی بیوی؟ آپ کے حالات۔

عجیب سی بات ہے۔ شاید سبھی کے ساتھ ایسا ہوتا ہے، لیکن میں نے اپنے ساتھ یہی

ہوتے دیکھا۔ دولت کے ساتھ مصروفیات بڑھ گئیں اور جب مصروفیات اشیاء سے وابستہ ہو جائیں ترقی منزل ہو تو پھر..... نہ روح کا مسئلہ رہتا ہے نہ محبت کا..... دولت کے دریا کا بہاؤ بہت تیز ہوتا ہے۔ اقبال! انسان اپنی مرضی سے پتوار چھوڑ نہیں سکتا .....بس ترقی ہی کرتا چلا جاتا ہے۔

آپ کو..... اپنی بیوی.....

وہ شاید پوچھنا چاہتی تھی کہ مجھے اپنی بیوی سے کتنا پیار تھا؟ عورتوں کو اس سوال میں بڑی دلچسپی ہوا کرتی ہے۔

بڑی اچھی تھی بیچاری۔ انتظار کا کشٹ کاٹتی کاٹتی چل بسی..... یہ عورت بھی بڑی بے بس ہے۔ کوئی اس پر انتظار ٹھونستا نہیں، لیکن اس کی روح میں انتظار ہے..... شاید وہ اس لئے راہ تکتی ہے کہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے واپس جنت میں لے جائے۔

وہ یکدم کرسی کی پشت سے سر لگا کر بیٹھ گئی۔ ایک چھوٹا سا آنسو اس کی بائیں آنکھ سے نکل کر گال پر آ ٹپکا۔

دیکھئے ہمایوں مونا کی ذہنی معذوری نے مجھے نڈھال کر دیا ہے..... میں اب اور کچھ برداشت نہیں کر سکتی..... میں ریزہ ریزہ ہو کر بے معنی ہو چکی ہوں۔

آپ کو تو وہ سب کچھ ملا جس کی کوئی عورت آرزو کر سکتی ہے۔

جی ملا..... یقیناً میں کسی قسم کا گلا نہیں کر سکتی لیکن..... پتہ نہیں اتنا سب کچھ بھی کیوں کافی نہ ہو سکا۔

نثار بہت امیر ہیں۔

بہت اور پھر بخیل نہیں۔ شاہ خرچ بھی ہیں۔ وہ آہستہ سے بولی۔

ایسا خوبصورت آدمی میری نظر سے نہیں گزرا..... میں نے شرم ساری سیکھا۔ گویا اس کی خوبصورتی میں میرا کوئی ہاتھ تھا یا میرا کوئی نقص پنہاں تھا۔

ہاں..... یہ بھی حقیقت ہے..... امریکن بھی انکے حسن کی تعریف کرتے ہیں۔

پھر آپ کو شاعری کا شوق تھا..... وہ بھی پورا ہو گیا۔ نثار کے اشعار سن کر لگتا ہے کہ فیض اور منیر دونوں کا رنگ اکٹھا ہو گیا ہے۔ میں نے حسد میں ڈوبی ہوئی تعریف کی۔

ہاں جی..... یہ بھی درست ہے..... لیکن سب کچھ ہوتے ہوئے ہر آرزو پوری ہو چکنے کے بعد بھی دل کچھ اور مانگتا ہے.....

میں اللہ جانے کیوں آرزو کا لفظ اس کے منہ سن کر بے تاب ہو گیا۔

اور؟ اور کیا؟

آپ یہاں امریکہ ہی میں رہنے کا ارادہ رکھتے ہیں ہمایوں صاحب۔

ارجمند کام کرتی ہے۔ اس کے بچوں کو میری ضرورت ہے..... جب وہ سکولوں سے واپس آتے ہیں تو گھر پر نہ بلال ہوتا ہے نہ ارجمند۔

اگر میں آپ سے کہوں کہ پاکستان لوٹ جایئے تو؟

لیکن کیوں اقبال! میرا تو وہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ اب تو اصغری بھی لوٹ گئی اپنے خالق کے پاس.....

پھر بھی لوٹ جایئے۔

کیوں..... لیکن کیوں لوٹ جاؤں..... وہاں وطن میں اب کچھ باقی نہیں رہا۔ کچھ آگے چلے گئے ہیں۔ کچھ بوریا بستر باندھے پلیٹ فارم پر تیار بیٹھے ہیں۔ فیملی سسٹم ٹوٹ رہا ہے۔ اب وہاں وہی خاندان اکٹھے ہیں جو بھیڑیوں کی قبیل سے ہیں۔ فرد کو جب مصیبت پڑتی ہے، وہ اپنے بھیڑیوں کے غول کو اکٹھا کر کے حملہ آور ہو جاتا ہے۔ ویسے کسی کے پاس دوسروں کے لئے وقت نہیں ہوتا..... تم مجھے واپس کیوں بھیجنا چاہتی ہو..... کس کے پاس؟ کون ہے وہاں میرا؟ میں کیا کروں گا وطن جا کر؟۔

میں.....؟ میں اب کسی امید کو اپنے اندر جنم دے کر بھسم نہیں ہونا چاہتی۔ اتنی مدت میں نے ہر صبح مونا کے لئے امید کا دیا جلایا اور رات کو اسے بجھا کر سوئی۔ میں موت

سے پہلے مر چکی ہوں ہمایوں۔ اب جو بھی مجھے پھونک مار کر زندہ کرے گا...... میرا دشمن ہوگا...... میں سیلینگ بیوٹی نہیں ہوں۔ مجھے کوئی پرنس چارمنگ درکار نہیں۔

کیا نثار؟ نثار تمہیں زندگی کی طرف نہیں کھینچتے۔

جس شخص میں اتنی ساری خوبیاں ہوں جو سارا وقت اپنی پرستش میں لگا ہو...... لوگ اس کی پوجا کرتے ہوں، اس کے پاس دوسروں کے لئے وقت کہاں؟ کامیاب انسان دوسروں کو بھی کامیاب ہی سمجھتا ہے۔ وہ ناکامی کو سمجھ نہیں سکتا۔ مایوسی کی زبان نہیں جانتا۔ میرا جھگڑا نثار سے نہیں ہے۔ میں تو روز ازل سے بی بی حوا کی طرح آدم کی روح کی متلاشی ہوں ...... میرا تو حساب کتاب ہی الٹا ہے۔ میں تو وہی چیز مانگ رہی ہوں جو اللہ کی اپنی امانت ہے۔ پھر...... ایسی صورت میں مجھے زندگی سے کیا مل سکتا ہے...... نہ نثار سے نہ کسی اور سے۔

کیا نثار تم سے محبت نہیں کرتے؟

کرتے ہیں۔ کرتے ہیں۔ بہت کرتے ہیں لیکن......

لیکن کیا اقبال...... بتاؤ ناں لیکن کیا......

میرے اندر ایک صحرا ہے ہمایوں مجھے محبت نہیں چاہئے۔ شاید میں کسی کا خدا بننا چاہتی ہوں۔ ایب نارمل مونا کے ساتھ رہ کر میں نارمل نہیں رہی...... اللہ کے لئے چلے جاؤ۔ اگر تم نے امریکہ نہ چھوڑا تو میں کسی اور جگہ چلی جاؤں گی...... اور میرا یہاں ٹھہرنا مونا کی صحت کے لئے ضروری ہے، بہت ضروری۔ وہ کچھ کچھ نارمل ہو رہی ہے ہمایوں جی۔

ایک بار وجہ بتا دو صاف صاف الفاظ میں...... میں جاننا چاہتا ہوں آپا کی خاطر۔

''میں آپ کو بتاؤں ...... یہاں آنے سے پہلے مونا کی ذہنی حالت کو دیکھ کر میں تلملایا کرتی تھی۔ میں نے مونا کے بڑے علاج کئے۔ ایلوپیتھک ، بائیو کیمیک، حکیمی علاج، ہومیو پیتھک۔ میں...... مونا کو...... اپنی Retarted بچی کو لے کر میں کہاں

کہاں نہ گئی۔ پھر جب میں علاج سے مایوس ہونے لگی تو میں نے تعویذ، گنڈے، صدقات، وظیفے، پیر فقیر پکڑ لئے۔ درگاہوں پر حاضریاں دینے لگ۔ میں معجزے کے انتظار میں رہتی اور وہ ہو نہ چکتا۔ میں پاؤں جلی ایک روز ایک درگاہ پر جاتی، دوسرے دن کسی اور ڈیرے پر..... میرے آنسو نہ رکتے تھے..... ایک بابا جی نے میری بے قراری دیکھ کر کہا۔"

بیٹا اب تلاش بند کر دے۔ علاج سے منہ موڑ لے۔ راضی برضا ہو جا..... میں نے چیخ کر کہا۔ کیوں؟ کیوں بابا جی میں تو آخری سانس تک مونا کے لئے جدوجہد کروں گی۔ میں جو کہتا ہوں تجویز چھوڑ دے بی بی..... آپی صحت ہو جائے گی اور اگر صحت نہ ہوئی تو قرار آ جائے گا۔ بس تجویز چھوڑ دے..... بابا جی بولے۔

میں چلاتی رہی..... کیوں تجویز نہ کروں، کیوں کیوں کیوں؟

ماننے کے لئے جاننا ضروری نہیں بیٹا..... پہلے مان لو..... پھر اللہ نے چاہا تو جان بھی جاؤ گی۔ بابا جی بولے۔

اقبال چپ ہو گئی۔

یہ چپ کا وقفہ ہم دونوں پر بھاری تھا۔

آپ پلیز جلد از جلد یہاں سے چلے جائیں..... میں اب کسی امید کے حوالے نہیں ہونا چاہتی۔ پلیز مان جائیے، مان جائیے پلیز۔

میں خاموشی سے اٹھ گیا۔ اقبال نے آہستہ سے اللہ حافظ کیا۔ میں ارجمند تک پہنچا اور اسے بتایا کہ میں باہر کار میں اس کا انتظار کروں گا۔ نثار صاحب سے معافی مانگ لینا۔

آپ کی طبیعت خراب ہے تو واپس چلتے ہیں انکل بلال نے کہا۔ وہ طبعاً بھی ڈاکٹر ہے کسی کو علیل دیکھ کر تلملا اٹھتا ہے۔

نہیں ایسی ویسی کوئی بات نہیں۔ مجھے نیند آ رہی ہے..... میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔

مان لینے کے لئے بعد مجھے تھوڑی دیر تنہائی کی ضرورت تھی۔

ابا پرانے زمانے کا باپ تھا۔ وہ ٹمپل روڈ پر گھر والوں سے کٹ کر گھر کے برآمدے میں چارپائی ڈالے اپنی ریٹائرمنٹ کے دن گزارا کرتا۔ کبھی کبھار اس کے دفتر والے آجاتے تو کچھ دیر کے لئے برآمدے میں رونق ہو جاتی۔ ورنہ وہ اپنے خالی دن اور راتیں ان پرندوں کو دیکھنے میں بسر کرتا جو دیواروں پر آکر بیٹھتے اور اڑ جاتے۔ ابا ساری عمر نوکری کی چکی میں پستا رہا۔ اسے دوست بنانے کا وقت نہ ملا۔ رشتہ داریاں نبھانے کی نوبت نہ آئی۔ قیام پاکستان کے بعد اس کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ وہ نئے لوگوں سے رابطے بنا کر نباہ سکتا۔ بس دوسروں کے ساتھ رگڑ کھانے کے بجائے اس نے اپنے آپ کو ساحل بنا لیا۔ ہم پانی کی طرح اس کے ساتھ ساتھ ضرورت تھے، لیکن ہم ساحل کی مجبوریوں سے ناواقف تھے۔

اس روز میں گھر میں داخل ہوا۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ مجھے ابا نظر نہ آیا۔ میں اس روز طیش میں تھا۔ برآمدے میں گھستے ہی میں نے ستون کو مکا مارا تو ابا نے کھنگار کر اپنے وجود کی اطلاع دی۔

سنو ہمایوں۔

سنانے کے لئے ابا نے آج تک کبھی نہیں بلایا تھا۔ کان کھینچنے والے کام اماں کے سپرد تھے۔ وہ ہمیں ابا سے ایسے بچایا کرتی جیسے مرغی چوزے کو چیل کے جھپٹے سے بچاتی ہے۔

بیٹھ جاؤ۔

یہ میرے لئے نئی بات تھی۔ میں چپ چاپ پائینتی کی جانب بیٹھ گیا۔

میں جانتا ہوں شاید اور تمہارے لئے یہ مشکل وقت ہے..... لیکن۔

وہ کچھ دیر چپ رہا، جیسے اپنے اندر بات کرنے کے لئے صحیح الفاظ کھوج رہا ہو۔

ایک راستہ وہ ہوتا ہے جو باپ بیٹے کے لئے چنتا ہے۔ ایک خواب وہ ہے جو بیٹا

اپنے لئے دیکھتا ہے۔ عام طور پر روایت سے بغاوت کا خواب ہر بیٹا دیکھتا ہے۔ میں تمہیں کوئی نصیحت نہیں کرنا چاہتا، کوئی راستہ تم پر تھوپنا نہیں چاہتا۔ بس ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ سنو گے؟

جب خالق حقیقی نے کھنکھناتی مٹی سے بابا آدم کو بنایا اور اس میں اپنی روح پھونک کر ابلیس سے کہا کہ لے اب تو آدم کو سجدہ کر تو ہمایوں..... روایت تو یہی تھی کہ جو حکم اللہ دیتا فوراً مانا جاتا، لیکن بغاوت نے پہلی بار بہشت میں جنم لیا۔ ابلیس نے سوچا کہ میں آدم سے بہتر ہوں، اسی لئے اس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا پہلی نافرمانی کی ایک ہی سزا ہے۔ اب تو صاحب اختیار ہے، تجھ کو میں نے ماننے والوں میں سے نہ پایا۔ یہ پتلا ماننے والوں میں سے ہوگا۔ اب تک تو جو کچھ میں نے تخلیق کیا، میرے ماننے والے ہیں۔ ابلیس چونکہ نافرمانی کیا مرتکب ہو چکا تھا، اب صاحب اختیار بھی گردانا گیا۔ اسی وقت تکبر کا شکار ہوا۔ کہنے لگا باقی سارے اختیار تو میں نہیں مانگتا، بس اتنا اختیار دے کہ میں تیرے اس لاڈلے کو تیری رحمت سے مایوس کر سکوں۔ جا تجھے روز قیامت تک مہلت ہے، اللہ نے ایک نافرمانی کے کے بدلے ابلیس کو صاحب اختیار کر دیا..... تو اب تک میں نے کیا سمجھایا ہمایوں فرید۔

نافرمانی کی سزا میں ابلیس صاحب اختیار ہوا۔

بالکل..... شاباش..... شاعر کو سمجھانا آسان ہے..... اب ابلیس تاک میں رہا کہ کیسے بابا آدم کو ورغلائے اور اللہ کی رحمت سے مایوس کرے۔ مدتیں گزر گئیں۔ اللہ کی ساری مخلوق سرشت بھر بدی کرتی اور سرشت بھر نیکی پر اکتفا کرتی۔ ابھی حضرت آدم کے اندر دوئی پیدا نہ ہوئی تھی اور اسی لئے تخلیق سے محروم تھے، اداس رہنے لگے۔ وہ نہ مادے سے کچھ بنا سکے، نہ ہی اپنے وجود کی فوٹو کاپی نکال سکنے پر قادر تھے..... اپنے ساتھ رہتے جب قرن بیت گئے تو اللہ نے ان کی پسلی نکال کر ان ہی کی ہم صورت ..... ان ہی کی جنس سے عورت کو جنم دیا..... اب تک دوئی حضرت آدم کے اندر تھی۔

اب باہر بھی صورت پذیر ہوگئی..... اب شیطان کے لئے حضرت آدم کو اللہ سے مایوس کرنا آسان ہوگیا۔ انہوں نے حضرت آدم میں تخلیق کی خواہش جگائی، نفس کی چنگاری جلائی۔ اماں حوا کی دوئی سے مدد لے کر حضرت آدم کو شجر ممنوعہ سے کھانے پر مجبور کیا۔ حضرت آدم ماننے والوں سے نہ رہے۔ وہ بھی اسی نافرمانی کے مرتکب ہوئے جو ابلیس کر بیٹھا تھا۔ اب باری تعالیٰ نے حضرت آدم اور مائی حوا سے کہا۔ جاؤ نیچے اتر جاؤ۔ آج سے تم صاحب اختیار ہو۔ پہلے تم ماننے والے تھے۔ تمہارے لئے ایک ہی راستہ تھا۔ اب تمہارے اندر دو ہیں، باہر دو ہیں۔ تم زوج اور متضاد کا شکار ہوئے۔ اب تمہارے اندر ایک راستہ رب کی اطاعت ہے ہے دوسری راہ ابلیس کی ہے۔ وہ تم میں ایسی خواہشات جگائے گا جن کا پورا کرنا یا ہونا ناممکن ہوگا..... تم انتظار کی صعوبت برداشت نہ کرسکو گے۔ صبر کی ڈھال لے کر نہ چل سکو گے..... ایسے میں تم مجھ سے مایوس ہو جاؤ گے..... پھر ابلیس تم کو اپنے گروہ میں شامل کرے گا..... آج کے بعد تم صاحب اختیار ہو۔ تمہارے اندر دونوں راستے ہوں گے۔ جو لوگ اللہ کے ماننے والے ہوتے ہوئے نبی کے آگے جھکنے اور اسکی حدود کو پار نہ کرنے والے ہوں گے۔ وہ ابلیس کے اغواء سے محفوظ رہیں گے اور جو بار بار اپنے نفس کے آگے جھکے، اپنی خواہشات کی رسی سے بندھے، وہ ابلیس کے یاروں میں سے ہوں گے..... تم آج کے بعد ابلیس کی طرح صاحب اختیار ہو..... یا اللہ کا راستہ چن لو یا ابلیس کا تمہیں اختیار ہے.....

جی.....

مجھے اور کچھ نہیں کہنا..... یاد رکھنا صاحب اختیار کی ذمہ داری بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اسے اپنے فیصلے کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔

میں چپ چاپ اٹھ کر اندر گیا تو اماں نے مجھے بلا کر کہا..... میں تیری منگنی اصغری سے کرنا چاہتی ہوں..... تیرا کیا خیال ہے۔

میں چپ رہا۔

تو نے اسے دیکھا ہے ناں.....

ایک نوکر انی صفت مسکین سی چھچھوندر میں نے کبھی کبھی گھر میں رینگتی دیکھی تھی۔

آپا سعیدہ کی نواسی ہے۔ بڑے سکھ دینے والی ہے۔

جی ٹھیک ہے جیسا آپ مناسب سمجھیں..... میں ماننے والوں سے ہوں۔

اماں بھی ٹھیک تھیں۔ اصغیر نے مجھے بڑے سکھ دیئے۔ یہ اور بات ہے کہ مجھے وہ خوشی نہ دے سکی، جس کی میں خواہش رکھتا تھا۔ میں نے اقبال کی مان لی۔ یہ فیصلہ بھی سکھ دینے والا تھا..... ایک بار پھر مان کر میں شانتی بھون میں داخل ہو گیا۔

پاکستان واپسی کا پلان اچانک بنا۔ ارجمند اس تجویز پر بہت جز بز ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ میں انتہائی خود غرض والد ہوں۔ اس نے اگلے پچھلے ان گنت واقعات اپنی لاگ بک میں میرے خلاف درج کر رکھے تھے۔ میں اس دعویٰ زاید المعیاد کو خاموشی سے سنتا رہا۔ پہلی بار مجھے پتہ چلا کہ میں کتنا خود غرض، عیار، بد معاش، کینہ ور بڈھا ہوں جو ساری عمر اپنی اولاد کے کام نہ آسکا۔ بلال اسے چپ کرانے کے انداز میں چھوٹے چھوٹے تنبیہی جملے چھوڑتا رہا، لیکن ان امدادی حربوں کا ارجمند پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ باپ دادا کے رول کو اپنے طور پر زندگی وقف الاولاد سمجھتی تھی۔ بچوں کے بچے ہو جانے کے بعد ہر نانا، نانی، دادا، دادی کا منصبی فرض تھا کہ وہ بچوں کی اولاد پالیں اور بچوں کو فراغت، آرام، تفریح اور آزادی کا تحفہ بہم پہنچائیں۔ وہ بار بار چیختی رہی۔

سنا تھا کہ اصل سے سود پیارا ہوتا ہے، لیکن ابا کے سینے میں دل ہو تب ناں۔ ان کو تو جمشید اور قیصر سے بھی پیار نہیں۔ پھر یہ کیسے ہمارے پاس رہ سکتے تھے۔

میں بھی اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن پتہ نہیں کیوں میں نے عادی مجرم کی طرح سر جھکا دیا۔

اپنا سامان پیک کرنے کے بعد آخری بار میں بیلکونی میں جا بیٹھا۔ بلال اور ارجمند ابھی کاموں سے نہ لوٹے تھے۔ سامنے بیلکونی پر گریک بڈھا سگریٹ پی رہا تھا۔ نچلے گھر میں ہندو عورت جینز اور بغیر آستینوں کی بنیان پہنے بچوں کے چھوٹے سے پلاسٹک سوئمنگ پول میں ٹیوب سے پانی بھر رہی تھی۔

سڑک صاف نہائی دھوئی لیٹی تھی۔ کوڑا اٹھانے والے گھروں کے آگے سے سارا گاربیج اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ دور گزرے بو میں ایک بوڑھا امریکن پائپ لگائے نیچے نشیب کی جانب دیکھ رہا تھا۔ جیسے کچھ سمجھنے سوچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ عام طور پر جمشید اور قیصر اپنے روبکو پر ہم رنگ پیلی، سفید، نیلی اور لال چوکوروں کا مربع بنایا کرتے ہیں۔ امریکن بھی اپنے زندگی کے روبکو کو ترتیب میں لا رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ ترقی کرنے والے یہ لوگ ہمیشہ پہلے جاننے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر مانتے ہیں۔ جو باتیں ان کی سمجھ میں آنہیں پاتیں، وہ انہیں شیلف کر دیتے ہیں اور وہ ریگستانی لوگ، پہاڑوں کی گپھاؤں میں سمادھی لگانے والے..... وہ لوگ جنہیں فلاح درکار ہوتی ہے اور جو ترقی کے بجائے فلاح کا انتخاب کرتے ہیں وہ پہلے سر جھکا کر مضبوطی سے ایمان کی ڈوری تھام لیتے ہیں۔ پھر بیکار تجسس سے ان کی وابستگی نہیں رہتی۔ راستہ طے کرنا ہی ان کی منزل بن جاتی ہے..... خوف وحزن ان کا ساتھی نہیں رہتا۔ وہ تبدیلی سے پہلے اپنے خیال میں تبدیلی سے خوفزدہ نہیں ہوتے..... بس صبر ہی ان کی ڈھال اور انتظار ہی ان کا واحد وسیلہ بن جاتا ہے۔

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔

پھر لاحول پڑھی..... یہ گھڑی بھی کیا ایجاد تھی۔ ہمیشہ اس کی سوئیاں بھاگتی ہی رہتی تھیں۔ اس کا کام دوسروں کو بھی بھگانا ٹھہرا۔ اگر غلطی سے کبھی سوئیاں رک جاتیں تو چابی دی جاتی، بیٹری بدل جاتی۔ میں بیلکونی سے سامان اٹھا کر باہر نکل آیا۔ اپنے دونوں بیگ میں نے پورچ کے سامنے رکھ دیئے۔ یہاں سے دور تک سڑک نظر آئی

تھی۔

بیگ رکھنے کے بعد میں ایک بار پھر اندر گیا..... کلائی سیگھڑی اتار کر میں نے ٹیلی ویژن پر رکھ دی۔ اتفاق سے یہاں ایک ڈی وی ڈی کا ویڈیو ٹیپ اور بچوں کا رو بیکر پڑا تھا۔ انسانی تخلیقات کا تعاقب کرنا میری عمر کے بس میں نہ تھا۔ اقبال نے مجھے ترقی کی دوڑ سے نکال کر ایک اور راستے پر ڈال دیا تھا۔ میں نے سوچا اگر صبر کے ساتھ ہی حکم ماننے کی شرط ہے تو پھر تو یہ گھڑی بالکل بیکار ہے۔ موت کے انتظار کے لئے موت کی جانکاری اس کے متعلق سارے استفسار بیکار ہیں۔ بھلا میرے بغیر انسان موت کی حقیقت کو جان بھی کیسے سکتا ہے..... گھڑی کو کلائی سے اتارنے کے بعد بعد میں جیسے رہا قیدی کی طرح باہر نکلا..... اور خالی سڑک پر دور تک نظریں جما دیں۔

خیال آرہا کہ انتظار فلاح کے راستے کا بڑا قیمتی ٹکٹ ہے۔ جو لوگ صحراؤں کا سفر کرتے ہیں، لیکن مان کر سر جھکا کر چلتے ہیں..... موت کی راہ تکتے ہیں، لیکن امید کے ساتھ..... جنہیں مسیح موعود کا انتظار ہوتا ہے، لیکن انتظار سے زیادہ وہ کچھ نہیں سوچتے ..... جو موسموں کو بدلتے دیکھ کر اپنی پسند کی رت کے منتظر نہیں ہوتے۔ وہ جن کو علم ہوتا ہے کہ ان کا ہیرا من طوطا انہیں کبھی مل نہیں سکتا اور پھر بھی وہ آہٹ سن کر دروازے کی جانب دیکھتے ہیں اور شانت رہتے ہیں..... وہ منتظر کرم جو حکم ملنے کے بعد مانتے ہی چلے جاتے ہیں، نہ تشریحوں میں پڑتے ہیں نہ تاویلوں میں۔ جنہیں نہ جاننے کی ضرورت ہوتی ہے، نہ حکم ماننے کے لئے کسی قسم کا لالچ درکار ہوتا ہے۔ نہ جنت کی خواہش، نہ دوزخ کا عذاب..... ایسے راضی برضا ہمیشہ اندر باہر ثابت قدم رہتے ہیں۔ نہ انہیں پلٹ کر دیکھنے کی خواہش ستاتی ہے، نہ کہیں لمبے راستے پر منزل نہ پانے کی آرزو غمزدہ کرتی ہے۔ ایسے لوگ..... فلاح کے راستے پر کتنی آسانی سے چلا کرتے ہیں۔ انتظار بھی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ نہ سخت دل بناتا ہے، نہ مایوس کر سکتا ہے فلاح کے بڑے پھاٹک کی چابی یہی مان لینا ہے۔